اسلامی معاشرے کے تہذیبی ارتقاء کا تربیتی نظام

The Educational System of the Cultural Evolution of the Islamic Society

Open Access Journal
Qtly. Noor-e-Marfat
eISSN: 2710-3463
pISSN: 2221-1659
www.nooremarfat.com
Note: All Copy Rights are Preserved.

Muhammad Furqan Gohar
Ph.D. Scholar. History of Islamic Civilization.
Mustafa International University, Qum, Iran.
E-mail: m.furqan512@yahoo.com

Abstract:

According to Islam, education is not only an individual matter but also a social and collective matter. In fact, social evolution elevates individuals. The present paper tries to discover the educational system of creating an ideal society from the perspective of Islam. The hypothesis is that this training system revolves around those attributes whose center is the love of Allah Ta'ala. In the shadow of this divine love, the Islamic society completes the journey of its cultural evolution and then it becomes capable of the love of Allah.

Allah Almighty has expressed in the Holy Qur'an that His special love is for the bearers of some special attributes. Following the Holy prophet (A.S) is at the top of these . The core of following the Messenger is human nature which produces different attributes. At the highest level in terms of these attributes are the "benefactors" who are the elite class of society.

“Benevolence” is the highest value, and on its basis, a person instills the best qualities in himself in the first stage and then shares these qualities to the people around him.

People with this trait develop the society due to their high level of consciousness, constant struggle and dedication.

They establish modern order in the society.
Next ti the value of "benevolence" is the value of "fairness" that is the backbone of any social and political system as Justice-minded people maintain justice and fairness in the society.

Key words: Education, Individuals, Society, System, Evolution, Love of Allah, Values, Benevolence, Fairness, Justice.

خلاصہ

اسلام کے نزدیک تربیت صرف فردی امر نہیں ہے بلکہ ایک سماجی اور اجتماعی معاملہ بھی ہے۔ درحقیقت سماجی ارتقاء ہی افراد کو بلند کرتا ہے۔ پیش نظر مقالہ اسلام کی رو سے مثالی معاشرے کی تشکیل کے تربیتی نظام کو کشف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرضیہ یہ ہے کہ یہ تربیتی نظام ان اوصاف کے گرد گھومتا ہے جن کا مرکز اللہ تعالی کی محبت ہے۔ اس محبت الٰہی کے سائے میں اسلامی سماج اپنے تہذیبی ارتقاء کا سفر طے کرتا ہے اور پھر وہ اللہ کی محبت کے قابل ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں کچھ اوصاف ایسے ہیں جن کے حاملین کے ساتھ اللہ تعالی نے اپنی خصوصی محبت کا اظہار کیا ہے۔ ہم ان آیات کو جب باہمی پیوستگی اور مربوط نظام کے طور پر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ملتا ہے کہ اتباع رسول ان میں سرفہرست ہے کیونکہ یہ باقی اوصاف کو بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اتباع رسول کا مرکز ذات انسان ہے جو مختلف صفات پیدا کرتی ہے۔ اوصاف کے لحاظ سے سب سے اعلی درجے پر "محسنین" فائز ہیں جو سماج کے خواص کا طبقہ ہے۔ احسان اعلی پائے کی قدر ہے جس کی بدولت انسان اپنے اندر پہلے مرحلے میں بہترین خوبیاں سمیٹتا ہے اور پھر اپنے اندر موجود خوبیوں کو آس پاس کے لوگوں میں بانٹتا ہے۔ اس صفت کے حامل لوگ اپنی شعوری بلندی، مسلسل جدوجہد اور جانثاری کے باعث معاشرے کو ارتقاء بخشتے ہیں۔ معاشرے میں جدید نظم و انصرام قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد انصاف پسندی کا مرحلہ ہے۔ جو کسی بھی اجتماعی و سیاسی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انصاف پسند "مقسطین" معاشرے میں عدل وانصاف کو قائم رکھتے ہیں۔

کلیدی کلمات: تعلیم، افراد، سماج، نظام، ارتقاء، اللہ تعالی کی محبت، اقدار، احسان، انصاف۔

مقدمہ

سہ ماہی مجلّہ "نور معرفت" کے مسلسل شمارہ نمبر 59 میں "مسلم سماج کے اخلاقی ارتقاء میں اللہ تعالی کی پسند و ناپسند کی تأثیر" کے عنوان کے تحت اپنے مقالہ میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ تعالی کا قرآن کریم میں اپنے بندوں سے اظہار محبت مسلم سماج کی اجتماعی تربیت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اظہار محبت جمع کے صیغے کے ساتھ ایسی

اوصاف کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جو اجتماعی اثرات رکھتی ہیں۔اجتماعی تربیت سے مراد افراد کی شعوری سطح کو اس انداز میں بلند کرنا ہے کہ وہ معاشرے کے اندر مفید اور مؤثر کردار نبھا سکیں۔ اس کے بالمقابل وہ اوصاف بھی اجتماعی اثرات رکھتی ہیں جن کے متعلق اللہ تعالی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اس حوالے سے علامہ طباطبائی کا نکتہ نظر بھی پیش کیا تھا جس کے مطابق اللہ تعالی کی محبت کا باعث بننے والے اوصاف و کمالات کے حامل حضرات ہی زمین کے حقیقی وارث بننے لائق ہیں۔[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان اوصاف کے اندر اتنی طاقت ہے کہ اگر سماجی سطح پر ان اوصاف کے حامل افراد مؤثر کردار ادا کریں تو وہ ایک مثالی معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جو کہ تہذیب یافتہ اسلامی معاشرہ کہلائے گا۔ تاہم اعلی پایہ کا اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ان صفات اور خصلتوں کو مربوط انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا ہم ان اوصاف کو کاٹ کاٹ کر اور الگ الگ سطح پر دیکھنے کے بجائے ایک رتبہ بندی شدہ نظام کے طور پر دیکھیں گے۔ تب جا کر یہ صفات سماجی سطح پر تہذیبی ارتقاء کا باعث بنیں گی۔ مقالہ حاضر ان صفات کو مربوط انداز میں دیکھنے کی ایک ابتدائی کاوش ہے۔

1۔اتباع رسول

محبت پروردگار کے سائے میں تشکیل پانے والے اسلامی سماجی میں تربیت کی سب سے بنیادی ترین سیڑھی «اتباع رسول» ہے۔ کیونکہ «اتباع رسول» ان تمام اخلاقی فضائل کو بنیاد فراہم کرتی ہے جو اعلی اخلاقی اقدار سے لبریز معاشرہ تشکیل دے سکتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (31:3)

ترجمہ: "اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔"

اتباع کیا ہے؟اس حوالے سے قرآنی لغات پر تحقیقی نظر رکھنے والے محقق «آقائے مصطفوی» لکھتے ہیں:

أنّ الأصل الواحد في هذه المادّة: هو القفو و الحركة خلف شيء مادّيّ أو معنويّ، و سواء كان الاتّباع عملا أو فكرا و الإتّباع هو افتعال و يدلّ على القفو بالاختيار و الإرادة [2]

یعنی: "اتباع کا اصل معنی ایک ہی ہے اور وہ ہے کہ کسی بھی مادی یا معنوی چیز کے پیچھے چلنا، چاہے وہ اتباع فکری ہو چاہے عملی۔اتباع کے اندر اختیار اور ارادے کا عنصر کار فرما ہوتا ہے"۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اتباع ایسی پیروی کو کہا جاتا ہے جس میں اختیار اور آزادی شامل ہو، یعنی اگر انسان کسی کی پیروی

کرنے یا نہ کرنے پر اختیار رکھنے کے باوجود بھی اس کے نقش قدم پر چلتا ہے تو وہ اس کی اتباع کرنے والا شمار ہو گا۔
اسوہ حسنہ / رول ماڈل ہماری زندگی میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم جب تک ان کی سیرت سے آشنا نہیں ہوتے، تب تک ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ کیا کرنا ہے۔
اب ہم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ «اتباع رسول» تمام الٰہی محبتوں کی بنیاد کیسے بنتی ہے؟ تو فرق دیکھئے کہ جہاں کہیں بھی اللہ تعالی نے «محسنین»، «متطہرین»، «توابین»، «مقسطین» وغیرہ کا ذکر کیا ہے، وہاں ان اوصاف رکھنے والے لوگوں کو اپنا محبوب قرار دیا ہے۔ یعنی نہیں فرمایا کہ میں «تم» سے محبت کرتا ہوں، بلکہ مذکورہ صفات کے حامل لوگوں سے اللہ تعالی اپنی محبت کا اظہار فرماتا ہے۔ کیونکہ خاص صفت کا بیان مقصود تھا۔ لیکن یہاں پر ذات کو مخاطب کرکے فرمایا: «یحببکم اللہ» یعنی تم لوگ اللہ کے محبوب قرار پاؤگے اور تمہاری ذات ہی محبوب خدا بنے گی۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی ان تمام اوصاف تک پہنچنے کے لئے ہمیں مخاطب کرکے فرمارہا ہے کہ اگر تم اتباع رسول کروگے تو« رسول » تمہیں ان اوصاف کی عملی تصویر نظر آئیں گے۔احسان، عدل، پاکیزگی کردار، امانت داری، صداقت، اللہ پر بھروسہ، سب میں آپ (ص) کی ذات گرامی بے مثال ہے۔ یوں آپ کی اتباع میں ہی یہ ساری اوصاف میسر آسکیں گی۔ لہٰذا اتباع رسول اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ آپ کو صحیح معنی میں متقی، پرہیزگار، احسان کرنے والا، اللہ پر بھروسہ کرنے والا، توبہ کرنے والا اور پاکیزہ زندگی گزارنے والا بنادے گی۔ چنانچہ علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

> و إذا اتّبعوا الرّسول اتّصفوا بكلّ حسنة يحبّها اللّه و يرضاها كالتّقوى و العدل و الإحسان و الصّبر و الثّبات و التّوكّل و التّوبة و التّطهّر و غير ذلك[3]
>
> یعنی: "جب وہ رسول کی اتباع کریں گے تو ہر اس اچھی صفت سے متصف ہو جائیں گے جسے اللہ تعالی پسند فرماتا ہے، جیسے تقوا، انصاف، احسان، صبر، ثبات، توکل، توبہ، پاکیزگی وغیرہ۔"

پس مذکورہ آیت سے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:
1۔ محبت پروردگار کا حصول انسان کو اتباع رسول کی دعوت دیتا ہے۔
2۔ اتباع ایک اختیاری عمل ہے۔ جس میں معرفت اور ادراک ضروری ہے۔
3۔ رسول اللہ ص کو اللہ تعالی نے نمونہ عمل / رول ماڈل کے طور پر پیش کیا ہے۔
4۔ تمام اعلی اقدار اور اخلاقی فضائل کی بنیاد «اتباع رسول» ہے۔
5۔ اتباع رسول اسلامی سماج کے اخلاقی ارتقاء کا بہترین ذریعہ ہے۔

2۔احسان

احسان کی حقیقت کیا ہے؟ احسان حسن سے ہے۔ حسن خوبی کو کہتے ہیں۔ احسان اسی خوبی کے پھیلاو کا نام ہے جو انسان کی ذات کے اندر ہے۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ احسان کے دو معنی ہیں: پہلا معنی: دوسرے کو نوازنا اور اس کا بھلا کرنا۔ جبکہ دوسرا معنی یہ ہے کہ انسان کے اندر کسی علمی یا عملی خوبی کا وجود۔ [4] امام علی (ع) کا اسی حوالے سے ایک قول ہے کہ "الناسُ أبْناء ما يُحْسِنُون"[5] یعنی: لوگ فرزند ہیں اس چیز کے جسے وہ بخوبی سمجھتے/عمل کرتے ہیں۔ بعض اہل لغت نے اسے یوں معنی کیا ہے: «مَنْسُوبونَ إلى ما يَعْلَمونَه و ما يَعْمَلُونَه مِن الأَفْعالِ الحَسَنَة»[6] یعنی انسان کا عمیق فہم و ادراک اور اس کی تجسم یافتہ عملی شکل انسان کی پہچان بن جاتی ہے۔ مثلاً جب ایدھی کا نام آتا ہے تو انسانی ہمدردی کے جذبات اور فلاحی خدمات اس کی پہچان ہے۔

احسان کی بحث کا آغاز اس واقعے سے کرتے ہیں جو امام زین العابدین علیہ السلام کی سیرت میں ملتا ہے۔ آپ کی ایک کنیز وضو میں آپ کی مدد کر رہی تھی کہ مٹی کا مشکیزہ اس کے ہاتھ سے گرا اور آپ کو زخمی کر دیا۔ وہ کنیز سہم گئی۔ دراین اثناء اس نے یہ آیت تلاوت کی: وَالْكاظِمينَ الْغَيْظَ وَالْعافينَ عَنِ النَّاسِ وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنينَ (134:3) یعنی: "جو لوگ غصہ پی جاتے ہیں، لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ تعالی محسنین سے محبت کرتا ہے۔"

جب اس نے پہلا جملہ کہا تو آپؑ نے فرمایا کہ میں نے غصہ کو پی لیا، جب دوسرا حصہ تلاوت کیا تو فرمایا: تمہیں بخش دیا، جب تیسرا حصہ تلاوت کیا تو حضرت امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا تم اللہ کی راہ میں آزاد ہو۔ [7] اس واقعے کے اخلاقی فوائد اپنی جگہ تاہم جس بنیادی نکتے کو سمجھنا مقصود ہے وہ احسان کی حقیقت ہے۔ امام سجاد علیہ السلام نے کیوں صرف کنیز کو سزا نہ دینے پر اکتفاء نہ کیا؟ کیونکہ آیت کا اقتضاء یہی تھا۔ معاف کرنا احسان کی اندرونی شکل ہے۔ اس کا عملی اظہار احسان کی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ لہٰذا یہ احسان کنیز کی آزادی پر ختم ہوا۔

آیات کریمہ میں احسان اور معاف کرنے کے درمیان بڑا گہرا رشتہ قائم ہے۔ فرمایا: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنينَ یعنی: "انہیں معاف کر دو اور چشم پوشی کر لو، بیشک اللہ تعالی محسنین سے محبت کرتا ہے۔" اس وضاحت کی روشنی میں ہم کئی ایک آیات کو سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ آیت: وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْها حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَداً وَادْخُلُوا الْبابَ سُجَّداً وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطاياكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنينَ (58:2) ترجمہ: "جب بنی اسرائیل نے غلطیاں کیں اور اللہ تعالی نے انہیں اجازت دے دی کہ ایک بستی میں داخل ہو جاو تو فرمایا کہ دوازے کے اندر داخل ہوتے وقت سجدہ کرو (جھکو) اور کہو کہ ہمارے گناہ جھڑ جائیں۔ اگر ایسا کروگے تو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے اور ہم محسنین کو مزید بھی عطا کریں گے"۔

اس آیت کے مطابق بھی محض انکساری اور استغفار کے بدلے میں گناہوں کی معافی کا اعلان ہے۔ جبکہ احسان کرنے والوں کے لیے مزید بہتر مقامات کا وعدہ دیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ احسان محض انکساری اور استغفار جیسے اندرونی صفات سے آگے کی چیز ہے۔ فرمایا: وَ أَنْفِقُوا فی سَبیلِ اللهِ وَ لا تُلْقُوا بِأَیْدیکُمْ إِلَی التَّهْلُکَةِ وَ أَحْسِنُوا إِنَّ اللهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنین (195:2) یعنی: "اللہ کی راہ میں انفاق کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو اور احسان کرو، بیشک اللہ تعالی احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

اس آیت میں بھی انفاق اور خود کو ہلاکت سے بچانے کے بعد، احسان کا مرحلہ ہے۔ انفاق کا تعلق بھی دوسروں سے ہی ہے، لیکن احسان اس سے بھی ارتقاء یافتہ ہے۔ مثلا والدین پر انفاق کا حکم کسی آیت میں نہیں ہے۔ ہمیشہ قرآن نے والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے: وَ وَصَّیْنَا الْإِنْسانَ بِوالِدَیْهِ حُسْناً (8:29) یعنی: "، ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ وہ والدین کے ساتھ خوبی کرے۔" احسان کرنے کے لیے بہت کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، احسان فریق مقابل کی ضرورت کے پیش نظر ہوتا ہے، جبکہ انفاق آپ کی استطاعت کے مطابق۔ مثلا والدین کو کبھی آپ کے پیسے سے زیادہ وقت، خلوص، خدمت اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

1. احسان اندرونی خوبیوں کے عملی اظہار کا نام ہے۔
2. انسان کی خوبیاں اس کی پہچان بن جاتی ہیں۔
3. ہمارے پیشواؤں کی سیرت احسان پر قائم تھی۔
4. احسان کا درجہ انفاق سے اونچا ہے۔
5. محسنین کا مقام پانے کے لیے «معاف کرنا» ضروری ہے۔

محسنین کی صفات اور مقام

احسان کی حقیقت واضح ہونے کے بعد اہم مسئلہ «محسنین» کا مقام ہے۔ اور یہ کہ محسنین کن کن خصوصیات اور اخلاقی صفات کی بنیاد پر لوگ «مقام احسان» تک پہنچتے ہیں؟ حضرت یوسف (ع) کو اللہ تعالی نے قرآن میں پانچ مرتبہ محسنین میں سے قرار دیا ہے (12:78، 56، 36، 22، 90)۔ (اور میری معلومات کی حد تک یہ تعداد قرآن میں کسی بھی دوسری شخصیت سے زیادہ ہے، مثلا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین بار اس صفت کے ساتھ ذکر کیا ہے (6:84، 37: 105 و 110)۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محسنین کے مقام کو پہچاننے کے لیے قصہ یوسف (ع) میں برجستہ ترین صفات کو سمجھا جائے۔

قصہ یوسف ایک خواب سے شروع ہوتا ہے۔ کنعان کی ایک چھوٹی سی بستی میں رہنے والا بچہ «بہت بڑا خواب» دیکھتا ہے۔ خواب یہ ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ باپ اسے کہتا ہے کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کو مت بتانا کہ تم سے حسد کرنے لگیں گے۔ (12: 4-5۔)

اس کے بعد یہی بچہ سختیاں مصائب برداشت کرتا ہے۔ کنویں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ مصر کے بازار میں «ثمن بخس» یعنی ناچیز سے مال کے عوض اس کا سودا ہوتا ہے اور پھر عزیز مصر کی غلامی میں آجاتا ہے۔ وہاں سے اپنی پاکدامنی کے سبب زندان کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ پھر وہ قیدیوں کو دعوت توحید دیتا ہے۔ اہل زندان پر آپ کی اثر اندازی کا یہ عالم ہے کہ دو آدمی «خواب» دیکھتے ہیں اور اجنبی ہونے کے باوجود وہ حضرت یوسف (ع) سے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں، یہ کہہ کر کہ ہم تمہیں «محسنین» میں سے پاتے ہیں۔ یہاں پر احسان کا مفہوم گذشتہ بیان کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ راغب نے کہا تھا کہ احسان دو قسم کا ہے علمی اور عملی۔ یہاں ایک مہارت اور علم کی بات ہو رہی ہے۔ کیونکہ انہیں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو انہیں خواب کی تعبیر بتلائے۔

مزید برآن، واضح طور پر سورہ یوسف ہی کی ایک آیت میں علم و حکمت کو احسان کی صفت کے ساتھ جوڑ دیا ہے، فرمایا: وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْماً وَعِلْماً وَكَذلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (12:22) یعنی: "جب حضرت یوسف جوان ہوئے، تو ہم نے اسے حکمت و دانائی عطا کی اور ہم محسنین کو اسی قسم کا اجر دیتے ہیں۔"

اسی حکمت ہی کے طفیل وہ مصر کے بادشاہ کے ہاں عزت و مقام پاتا ہے۔ ان مہارتوں اور دانشوری اور حکمت و امانت داری کے طفیل اللہ تعالی حضرت یوسف کو عزیز مصر بنا دیتا ہے۔ پھر وہی بھائی جو ایک دن اسے کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے اور خوش تھے کہ یوسف سے چھٹکارا پانے کے بعد اب وہ اپنی چھوٹی سی بستی میں آسودہ ہو کر رہ سکتے ہیں، ایک دن وہ بھی آجاتا ہے کہ اسی یوسف کے سامنے التماس کرتے نظر آتے ہیں کہ «ایہا العزیز! » اے مصر کے بلند مرتبہ شخص! ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے تم اگر چاہو تو ہم سے نرم برتاو کرو اور بنیامین کے بجائے کسی اور کو رکھ لو۔ (إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ) ہم تمہیں «محسنین» میں سے سمجھتے ہیں۔

یہ عزیز مصر وہی بچہ ہے جس نے سختیاں مصائب جھیلے۔ لیکن اپنی حکمت، مہارت اور امانت داری کے سبب مصر کے ایک اعلی عہدے پر براجمان ہے۔ حضرت یوسف کا کردار دونوں قسم کے احسان پر محیط ہے۔ وہ محسن ہے، نہ صرف اس لیے کہ اس نے اپنا دامن پاک رکھا، اپنے حاسد بھائیوں سے کینہ اور بغض نہ رکھا، اچھائی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور انہیں آخر میں یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ «لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم و ھو ارحم الراحمین»۔ «تم پر آج کوئی پکڑ نہیں ہے، اللہ تعالی تمہیں معاف کرے اور وہ ارحم الراحمین ذات ہے»۔ بلکہ وہ

محسن اس لیے بھی ہے کیونکہ اسے مصر کے سب سے اہم ترین ہنر یعنی تعبیر خواب پر عبور حاصل ہے۔ جہاں مصر کے بڑے بڑے «کاہن» «پیشگو» عاجز نظر آئے، وہیں حضرت یوسف تعبیر خواب میں ماہر نظر آئے۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی صلاحیت، محنت اور کوشش سے اہل مصر کو ایک بہت بڑے معیشتی بحران سے نجات دلائی۔ سات سال قحطی کے لیے تدبیر اندیشی کی، اسے پھر عملی جامہ پہنایا اور لوگوں کو قحط سالی سے نجات دلائی۔ اور اپنے اس دعوے کو سچ کر دکھایا کہ «انی حفیظ علیم» میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور دانا بھی ہوں۔

حضرت یوسف (ع) اس لیے بھی «محسن» ہے کہ اس نے مصر کی چکا چوندھ کرنے والے تہذیب میں اپنے وجود کی خوبصورتی کو بھسم نہ ہونے دیا۔ اس نے اپنا پاکیزہ کردار اور «توحیدی نظریہ» برقرار رکھا۔ یوں اس نے انسانیت کی عظیم خدمت کرکے مصر میں اپنا بلند مقام پایا۔ رب کریم نے یوں پھر احسان سے پنپنے والے عبد اور معبود کے رابطے کو بیان کیا: وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَ لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (56:12) یعنی: "اور یوں ہی ہم نے یوسف کو زمین میں طاقت عطا کی، جہاں چاہے اپنا ٹھکانہ بنائے، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہیں نواز دیتے ہیں اور ہم «محسنین» کا اجر ضائع نہیں ہونے دیتے۔"

«محسنین» اور سماجی ارتقاء

ہمارا اصل مفروضہ یہ ہے کہ ان آیات کو مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے اتارا گیا ہے۔ اس لحاظ سے احسان جیسی بنیادی صفت کے سماجی کردار پر تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ «احسان» ایک متعدی صفت ہے۔ یعنی اپنی اندرونی خوبیوں کا دوسروں کے ساتھ عملی اظہار ہے۔ یہ خوبیاں علم و حکمت اور معرفت کے میدان میں بھی ہو سکتی ہیں۔ اخلاق و عمل اور نیکی و بھلائی کے میدان میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک آیت میں فرمایا کہ محسنین کی نہ صرف آخرت بلکہ دنیا بھی اچھی ہوتی ہے: فَآتَاهُمُ اللهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَ اللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (148:3)۔ یعنی: "اللہ تعالی نے انہیں دنیا کی پاداش بھی دی ہے اور آخرت کا بہتر ثواب بھی عطا کیا ہے اور اللہ تعالی محسنین سے محبت کرتا ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ محسنین دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور اہل نظر جانتے ہیں کہ دنیوی کامیابیاں اور کامرانیاں فردی نہیں بلکہ سماجی ہوتی ہیں۔ ناکام معاشروں میں افراد کامیاب ہو کر بھی ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ کامیابی کا ایک سرا خود انسان کے ہاتھ میں ہے، دوسرا سرا سماج سے جڑا ہے۔

ایک اور آیت میں فساد اور احسان کو ایک دوسرے کے متضاد کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ فرمایا:

وَ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوهُ خَوْفاً وَ طَمَعاً إِنَّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ (56:7)

یعنی: "زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو اور اللہ کو خوف اور امید کے ساتھ پکارو، بیشک اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہے۔"

اس آیت سے نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ محسنین فسادی نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اس روئے زمین پر اپنے فکر و عمل سے بہتری لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ «اعتداء» کا مفہوم بھی جڑا ہے۔ یعنی زیادتی اور دوسروں کا حق مارنا۔ یہ اللہ تعالی کو ناپسند ہے۔ یہ دو آیات ایک ساتھ آئی ہیں جن میں سے ایک میں فرمایا کہ اللہ تعالی «معتدین» کو پسند نہیں کرتا (55:7)۔ اگلی ہی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالی کی رحمت «محسنین» کے قریب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پسندیدہ سماج «محسنین» کی کثرت اور ان کی اگوانی سے تشکیل پاتا ہے، جبکہ ناپسندیدہ سماج مفسدین اور معتدین کے بل بوتے پر تشکیل پاتا ہے۔

ایک اور صفت جو قرآن نے محسنین کے لیے ذکر کی ہے وہ ہے خالصانہ جدوجہد۔ یعنی یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی راہ میں سچی نیت کے ساتھ جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ فرمایا: وَ الَّذینَ جاهَدُوا فینا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنا وَ إِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنینَ (69:29) یعنی: "وہ لوگ جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم انہیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں اور اللہ تعالی تو محسنین کے ساتھ ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ «محسنین» محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ بیکاری، سستی، کاہلی اور اس جیسی خصلتوں کے مالک کبھی مقام احسان تک نہیں پہنچ پاتے۔

حضرت یوسف نے سیاسی اور سماجی میدان میں صرف ایک ہی دعوا کیا، اسے پورا کرنے میں سات سال لگا دیئے۔ ایک جملہ منہ سے نکالا (انی حفیظ علیم) اس پر عمل کرتے ہوئے سات سال لگائے۔ ہمارے سماج کے اندر دعووں کی بھرمار ہے، عملی نتائج ناپید ہیں۔

امام علی (ع) کا ایمان و کفر کے شعبوں پر ایک جامع خطبہ ہے، جس میں آپ نے تقوا کو ایمانی لشکر کے تدارکات سے تشبیہ دی ہے، جبکہ «محسنین» کو اس لشکر کا دلیر سپاہی قرار دیا ہے: التَّقْوَى عُدَّتُهُ وَ الْمُحْسِنُونَ فُرْسَانُه»۔[8] یہ ایمانی سماج کے اندر «محسنین» کے کردار کو پہچاننے کے لیے انتہائی خوبصورت استعارہ ہے۔ سماجی ارتقاء کے لئے ہمیں احسان کا دائرہ بھی بڑھانا ہے اور محسنین کی تربیت بھی کرنی ہے۔ ہمارا سماج آگے بڑھنے کے لیے اس صفت کے حامل افراد کا محتاج ہے۔ حضرت یوسف (ع) جیسے پاکدامن، سخت کوش، جدوجہد کرنے والے، اپنے عزائم میں پختہ، یقین کے پیکر، بات پر پورا اترنے والے افراد ہماری سماجی اور سیاسی ضرورت ہیں۔ قرآنی منطق کے مطابق عمل کے میدان میں صرف «محسنین» ہی کامیاب ہیں۔ زیادتی کرنے والے «معتدین» اور فساد پھیلانے والے «مفسدین» سماجی ارتقاء میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے بلکہ الٹا معاشرے کو انحطاط اور پستی کی طرف دھکیلتے ہیں۔

3۔انصاف پسندی

قرآنی منطق کے مطابق احسان کے ساتھ عدل کا مفہوم جڑا ہے۔«بے شک اللہ تعالی عدل و احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے» (النحل: ۹۰)۔یہ بھی فرمایا کہ «اے ایمان والو «قسط» قائم کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرو اور اللہ کے لیے گواہ بنو اگرچہ یہ گواہی تمہارے یا تمہارے قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو(4:135)۔ چنانچہ راغب اصفہانی نے کہا ہے، قسط سے مراد کسی بھی چیز کو بانٹنے میں انصاف سے کام لینا ہے،(مفردات، ص670)

اللہ تعالی نے پانچ بار «محسنین» کے ساتھ اظہار محبت فرمایا ہے، جبکہ «مقسطین» کے ساتھ تین بار محبت کا اظہار فرمایا ہے۔ محبت کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالی کی خصوصی عنایت، توجہ اور عطاء ایسے لوگوں کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ «مقسطین» یعنی انصاف پسند لوگوں کے ساتھ محبت کا ذکر جن آیات میں ہوا ہے، خود ہر ایک آیت اپنی جگہ دلچسپ ماجرا لیے بیٹھی ہے۔آیئے ان تینوں آیات پر ایک نظر دوڑاتے ہیں:

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ فَإِنْ جاؤُكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئاً وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ» (42:5)

(مدینہ کے یہودی) جھوٹ سننے کی عادت رکھتے ہیں اور حرام خور ہیں۔اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کے درمیان فیصلہ کرو یا منہ موڑ لو۔اگر منہ موڑ لوگے تب بھی وہ آپ کو نقصان نہیں پہنچا پائیں گے اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بیشک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

دوسرا ذکر سورہ حجرات میں ہے۔ سورہ حجرات مسلمانوں کے آپس کے معاملات درست کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔اس میں بہت سے اخلاقی اور اجتماعی احکام موجود ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی سماج کے تہذیبی اصولوں کا ایک مجموعہ اس سورے میں اتارا گیا ہے۔اس کی نویں آیت میں انصاف کا تذکرہ ہے، فرمایا کہ

وَإِنْ طائِفَتانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُما فَإِنْ بَغَتْ إِحْداهُما عَلَى الْأُخْرى فَقاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلى أَمْرِ اللهِ فَإِنْ فاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُما بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (9:49)

اگر مؤمنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کروادو۔اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے کے ساتھ مقابلہ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان انصاف کی بنیاد پر صلح کرو اور انصاف سے کام لو بیشک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

تیسری آیت جس میں انصاف کرنے والوں سے محبت کا تذکرہ ہے وہ سورہ ممتحنہ میں ہے۔سورہ ممتحنہ مسلمانوں

کے بیرونی روابط کے بارے میں ہے۔ یعنی محکمہ خارجہ اور اپنے زمانے کی خارجہ پالیسی کا تعین اس سورہ میں ہوا ہے۔ مسلمانوں کو کفار اور معاندین اور عام غیر مسلم افراد کے ساتھ کیسے برتاؤ کرنا ہے؟اس کے بنیادی اصول اس سورہ میں سکھائے گئے ہیں۔

اسی سورے کی آٹھویں آیت میں فرمایا: لاَيَنْهاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذينَ لَمْ يُقاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَ لَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَ تُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطينَ(8:60) یعنی: "اللہ تعالی تمہیں ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے آپ سے دین کی وجہ سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا،اس چیز سے نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ بھلائی کرو،اور انصاف کا سلوک کرو، بیشک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔"

ارتقائے سماج اور انسانیت کے لیے انصاف پسند معاشرے کی تشکیل اولین ضرورت ہے۔ ان تین آیات میں تین اہم شعبوں پر انصاف کی حکومت قائم کیے جانے کو انتہائی پسندیدہ فعل کے طور پر قرار دیا گیا ہے۔

ایک، وہ انصاف جو خود محکمہ انصاف میں ہوتا ہے۔ یعنی عدلیہ جس کا نام ہی عدل سے جڑا ہے وہاں ماورائے عدل فیصلے انتہائی شرمناک اور ناپسندیدہ ہیں۔ کسی بھی سماج کی کشتی ڈبونے کے لیے یہی «محکمہ ناانصاف» ہی کافی ہوتا ہے۔

دوسرے، خود مسلمانوں کے آپس کے تنازعات، یہ چاہے سیاسی ہوں یا مسلکی نوعیت کے ہوں، چاہے ذاتی معاملات پر ہوں، ان میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا اللہ تعالی کے پسندیدہ معاشرے میں بہت بنیادی امر ہے۔ایسا سماج جہاں تنازعات کو تعصب اور جانبداری کی شہ میسر ہو وہ کبھی بھی تنازعات سے باہر نہیں آسکتا۔ تنازعات میں گھرا معاشرہ بحران زدہ اور دیمک زدہ ہوتا ہے۔اس کی توانائیاں منفی کاموں پر خرچ ہو رہی ہوتی ہیں۔

تیسرے، غیر مسلم سماج کے ساتھ تعلقات کا معاملہ ہے۔ ایسے لوگ جن سے ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا، چاہے وہ سکھ ، ہندو، بدھ مت ہوں یا جین مت ، یہودی اور عیسائی یا کسی بھی دوسرے مذہب کے لوگ ہوں، ان کے ساتھ اچھائی اور انصاف کا معاملہ کیا جانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ انسانیت میں سب لوگ مشترک ہیں۔ بقول حضرت علی ع کے انسان دو طرح کے ہیں یا تمہارے دینی بھائی ہیں یا پھر انسانیت میں تیرے جیسے ہیں۔ (نہج البلاغہ: مکتوب 53) یہی قرآنی حکم ہے جو سورہ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اتارا گیا ہے۔

عدل وانصاف پر مبنی سماج کا قیام

عدل کا معنی ہر چیز کو اس کا مناسب مقام دینا ہے۔ عدل، لیاقت کی بنیاد پر مقام و منصب دیے جانے کو یقینی بتانا ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا: العدل یضع الامور مواضعها[9] یعنی: "عدل، امور کو اپنی واقعی جگہ پر رکھتا ہے۔" قرآن کریم کے مطابق رسولوں کے بھیجے جانے کا ایک ہدف «لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ» (25:57) تھا؛

یعنی یہ کہ لوگ خود انصاف کے تقاضے پورے کریں۔

لہٰذا لوگوں کو، بالخصوص اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ ظلم کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور عدالت خواہی ان کا حکمرانوں سے اولین مطالبہ ہونا چاہیے: و إنصاف كلّ مظلوم من ظالمه، و منع كلّ ظالم من ظلمه[10] یعنی: "ظالم کا ساتھ کبھی نہ دیں۔ ہمیشہ مظلوم کے حق میں آواز اٹھائیں۔ ظلم کی نوعیت کو سمجھیں اور ہمیشہ اس پر آواز اٹھائیں۔ یہ سب انفرادی درجات ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: إِنَّ الْمُقْسِطِينَ، عِنْدَ اللَّهِ، عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ عَنْ يَمِينِ الرَّحْمَنِ عَزَّ وَ جَلَّ. وَ كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ؛ الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَ أَهْلِهِمْ وَ مَا وَلُوا[11] یعنی: "بے شک انصاف کرنے والے اللہ کے ہاں، اللہ کے دائیں جانب نور کے منبروں پر جلوہ فگن ہوں گے اور اللہ کے ہاں دائیں بائیں کا فرق نہیں ہے (کیونکہ وہ جسم و جسمانیت سے پاک ہے) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے فیصلوں میں، اپنے اہل و عیال میں اور جس چیز پر انہیں سرپرستی دی گئی عدل و انصاف سے کام لیا۔"

عدل کے قیام میں عدل قائم کرنے والے منصف اور قاضی کے وجود پر عدالت کی حکمرانی شرط ہے۔ یعنی وہ شائستہ فیصلے کرے اور کسی طرف بلاجواز جھکاو نہ دکھائے۔ اسلامی معاشرے میں عدالت کے قیام کے لیے دوسری چیز، اللہ تعالی کے رضا اور اس کے حکم کی بجاآوری کے لیے گواہی دینا ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی عدالت کا نظام اکثر، گواہیوں پر چلتا ہے۔ گواہی کو گواہ کے مشاہدے کے عین مطابق اور "شہداء للہ"، یعنی خدا کے لیے گواہی دی جائے؛ نہ کہ رشتہ داریوں اور تعلقات کی بنیاد پر۔

چند تجاویز

سماجی عدل و انصاف کے قیام کے سب سے اہم امر خود سماجی نظام کی اصلاح ہے۔ یعنی ایک ملک و سماج کے تمام ادارے لیاقت، استعداد اور عدل و انصاف کی بنیاد پر کھڑے ہوں۔ کوئی شخص یا کوئی ادارہ مال و دولت یا اداری اختیار و نفوذ کی بنیاد پر عدالتوں سے اپنی پسند کے فیصلے نہ کروائے۔ نیز قرآنی ارشادت کی بنیاد پر عدل و انصاف کے عمل میں کوئی رشتہ داری اور تعلقات کارفرمانہ ہوں؛ نہ قومی، مسلکی، سیاسیی یا لسانی تعصّبات وغیرہ۔ نیز سفارش کلچر اور رشوت خوری کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح مختلف مافیاز جو کہ ریاست کے رقیب ہوتے ہیں، اُن کا قلع قمع ضروری ہے۔ درحقیقت، مافیاز، ریاستی کی رٹ کو چیلنج کرتے ہیں۔ انہوں نے ہر ادارے، ہر میدان اور ہر سماجی شعبے میں اپنے «بندے» بٹھائے ہوتے ہیں۔ یہی سہولت کاری کرتے ہیں۔ انہیں معاونت فراہم کرتے ہیں کہ اپنی مرضی کے قوانین، اپنی مرضی کے ایکٹ بنوائیں، اپنی مرضی سے انہیں تفسیر کریں، اپنی مرضی کی حد تک

انہیں لاگو کریں۔ یہ عدل وانصاف کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ مافیاز کا خاتمہ کسی بھی فلاحی ریاست کی اولین ترجیح ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قوانین کی مسلسل اصلاح اور بدلتے حالات اور شرائط کے مطابق ان کی تشریح اور تبصرے، عدل وانصاف تک پہنچنے کی اہم سیڑھی ہے۔ لہٰذا قوانین صاف شفاف، قابل عمل اور عدل و انصاف کی بنیاد پر وضع کیے جائیں۔

انصاف کی خرید وفروش اور سماجی انحطاط

ایک حکیمانہ قول ہے کہ عادل حکمران موسلا دھار بارش سے بھی زیادہ بابرکت ہوتا ہے۔[12] چنانچہ امام علی (ع) جب مسند خلافت پر بیٹھے تو اپنے سپہ سالاروں کی طرف ایک ہی مضمون پر مشتمل یہ خط لکھا: أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ مَنَعُوا النَّاسَ الْحَقَّ فَاشْتَرَوْهُ وَ أَخَذُوهُمْ بِالْبَاطِلِ فَاقْتَدَوْه[13] یعنی: "اللہ تعالی کی حمد و ثناء کے بعد، جان لو کہ تم سے پہلی اقوام عالم کی ہلاکت صرف اور صرف اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے لوگوں کو ان کا حق نہ دیا، جس کے نتیجے میں لوگ اپنا حق پیسے دے کر خریدنے پر مجبور ہوئے، اور انہیں باطل پر اکسایا، تو لوگوں نے باطل میں ان کی پیروی کی"۔

قومی سطح پر ہلاکت کا مفہوم قابل غور امر ہے۔ کبھی تو ہلاک ہونے سے مراد کسی قوم کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا ہے، جبکہ کبھی وہ دنیا میں رہتے ہوئے، فساد، کرپشن، اور ظلم کی دلدل میں گھر جانے کے باعث اس حد تک ذلت، پستی اور انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے کہ عدل وانصاف، ایثار وقربانی، مساوات، اخوت وبرادری و بھائی چارہ، استقلال اور آزادی فکر و بیان، روشن ضمیری اس جیسے بلند مرتبہ انسانی اقدار وہاں اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں اور یوں وہ قوم کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہتی۔ دوسروں کی نوکری اور چاکری اس کا مقدر ہوتی ہے۔ فرد کو چھوڑ پوری کی پوری قوم ایک قسم کی غلامی اور ذلت میں ڈوب جاتی ہیں، اس فقر وفلاکت اور ایسی بدبختی اور ذلت کو اگر ہلاکت نہ کہا جائے اور تو اور کیا نام دیا جانا مناسب ہے؟؟؟

دنیا جہان کی مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھنے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں بھی معاشرتی سطح پر خوشحالی اور تنومندی آئی تو اس کی وجہ حق اور حقوق کی پاسداری ہے، جس کا دوسرا رخ ہر ایک کا اپنی اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقے سے نبھانا ہے۔ ان دونوں میں حکمران طبقے کا کردار سب سے بنیادی نوعیت کا ہے۔ مولا علی ع کے اس خط میں چند اہم نکات کی طرف اشارہ ہے:

1۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ادارہ جات میں پائی جانے والی بدعنوانیوں کی جڑ حکمران طبقہ ہے اور یوں فساد سب سے پہلے اوپر کی سطح پر رونما ہوتا ہے، اور لوگ فقط تقلید کرتے ہیں، یعنی لوگوں کا کام پیروی ہے۔

2۔ فساد اور بدعنوانی پھیلنے کی اہم وجہ ان کے بنیادی حقوق کا راستہ روک کر انہی حقوق کی قیمت وصول کرنا، اور یوں انصاف کی فراہمی جو کہ ہر انسان کا پیدائشی اور بنیادی حق ہے، اگر پیسوں میں بک رہی ہو تو سمجھو کہ ہلاکت اور تباہی اس قوم کا مقدر ہے۔

3۔ تیسری بات یہ ہے کہ اقوام عالم میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالی کی یہ «سنت» قائم و دائم ہے۔ اس لیے جہاں سماجی ترقی، فلاح و بہبود نظر آئے وہاں مذہب، دین، جغرافیا کی قید کے بغیر اس سماج کی ترقی کے علل و اسباب کا جائزہ لینا چاہیے اور ان سے الہام لے کر اپنی قوم کی حالت بہتر بنانے کی ترکیب سوچنی چاہیے۔

نتیجہ

اس تحریر میں مثالی معاشرے کے قیام میں قرآن کے تربیتی نظام کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ تربیتی نظام ان اوصاف کے گرد گھومتا ہے جن کو اللہ تعالی نے قرآن میں اپنی محبت اور توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ سب سے بنیادی صفت ایک جامع ترین اسوہ حسنہ کا وجود ہے، جس کی پیروی اور نقش قدم پر چلنا ہمارے معاشرے کی نجات کا ضامن ہے۔ قرآن کے نکتہ نظر سے وہ ہستی رسول اللہ کی ذات گرامی ہے۔

دوسری صفت احسان ہے، جس کا بہترین نمونہ حضرت یوسف ہیں، محسنین سماجی ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے سب سے زیادہ محبوبیت کا اظہار اسی صفت کے ساتھ کیا ہے۔ انصاف سے بھی زیادہ احسان پر زور دیا ہے، کیونکہ احسان کرنے والے لوگ عام سطح فکر اور سطح عمل سے اونچے ہوتے ہیں۔ وہ فداکاری اور جانثاری کے مرحلے پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ خواص کی سطح ہے جن کی علمی، فکری اور عملی خوبیوں سے سماج میں ارتقاء آتا ہے، انہی کے طفیل سماج چیلنجز سے نمٹنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ یوں محسنین کا وجود خود انصاف پسندی کو بھی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

احسان کے بعد عدل کی نوبت آتی ہے۔ سیاسی، سماجی اور قانونی سطح پر عدل و انصاف کا قیام ہی معاشرے کو فلاح یافتہ بنا سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے ایسے لوگوں کا وجود ضروری ہے، جو سرمایہ اور اقتدار سے پنپنے والے فساد کا شکار نہ ہوں اور اس سے مقابلے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ طبقہ محسنین سے تشکیل پاتا ہے۔ یوں محسنین اسلامی سماج کے تہذیبی ارتقاء میں حضرت یوسف (ع) کی مانند سب سے بنیادی کردار ادا کریں گے اور ان کے شانہ بشانہ «مقسطین» (انصاف پسند لوگ) اپنا کردار نبھائیں گے۔

*****

References

1. Muhammad Hussain, Tabatabai, *Al-Mizan fi Tafsir al-Qur'an*, Vol. 5, Chap. 2 (Beirut, Muasasat al'Elami lilmatbuat, 1390 SH), 383.

محمد حسین، طباطبایی، *المیزان فی تفسیر القرآن*، ج5، چاپ2 (بیروت، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، 1390 ھ ق)، 383۔

2. Hassan, Mustafawi, *Al-Tehqeeq fi Kalamat al-Qur'an al-Karim*, Vol. 1 (Tehran, Markz al-Kitab Lil-Tarajmat wa al-Nisher, 1402 AH), 377.

حسن، مصطفوی، *التحقیق فی کلمات القرآن الکریم*، ج 1 (تہران، مرکز الکتاب للترجمۃ والنشر، 1402 ھ ق)، 377۔

3. Tabatabai, *Al-Mizan fi Tafsir al-Qur'an*, 383.

طباطبائی، *المیزان فی تفسیر القرآن*، 383۔

4. Hussain bin Muhammad Raghib, Isfahani, *Muafradat 'alfaz al*-Qur'an, Vol. 1(Lebanon, Syria I, Dar-ul-Ilam - Al-Dar al-Shamiat, 1412 AH), 236.

حسین بن محمد راغب، اصفہانی، *مفردات الفاظ القرآن*، ج1 (لبنان، سوریہ اول، دار العلم-الدار الشامیۃ، 1412 ھ ق)، 236۔

5. Muhammad bin Yaqoub Abu jafar, kulani, *al-Kafi*, Vol. 1, Chap 4 (Tehran, Dar al-Kutub al-Islamiyahat, 1407 AH), 51.

محمد بن یعقوب ابو جعفر، کلینی، *الکافی*، ج 1، چاپ 4 (تہران، دار الکتب الاسلامیۃ، 1407ھ ق)، 51۔

6. Syed Muhammad Murtaza Hussaini, Mohib al-Din, Zubaidi, Wasti, Hanafi, *Taj al-Arous min Jawahir al-Qamoos*, Vol. 18 (Beirut, Dar al-Fikr Liltibat wa al-Nasher waltawze, 1414 AH), 143.

سید محمد مرتضی حسینی، محب الدین، زبیدی، واسطی، حنفی، *تاج العروس من جواہر القاموس*، ج18 (بیروت، دار الفکر للطباعۃ و النشر والتوزیع، 1414 ھ ق)، 143۔

7. Muhammad bin Ali, Ibn Babuyeh, *Al-Amali (Lal Saduq)*, Chaap. 6 (Tehran, np., 1376 SH), 201.

محمد بن علی، ابن بابویہ، *الأمالی (للصدوق)*، چاپ ششم (تہران، ناشر ندارد، 1376ش)، 201۔

8. Hassan bin Ali, Ibn Shuba Harani, *Tufh al-Aqool*, Chaap. II (Qum, np., 1404 AH/1363 SH), 164.

حسن بن علی، ابن شعبہ حرانی، *تحف العقول*، چاپ دوم (قم، ناشر ندارد، 1404 / 1363ق)، 164۔

9. Syed Muhammad Razi, *Nahj al-Balaghah* (Qum, Mas'isah Nahj al-Balaghah, 1414 AH), Hikmat 429.

سید محمد رضی، *نہج البلاغۃ* (قم، مؤسسہ نہج البلاغہ، 1414 ھ ق)، حکمت 429۔

10. Sulaiman bin Ahmad, al-Tabarani, *al-Tafseer al-Kabeer: Tafsir al-Qur'an al-Azeem* (Jordan, Irbid, 2008), 312.

سلیمان بن احمد، طبرانی، *التفسیر الکبیر: تفسیر القرآن العظیم* (اردن، اربد، 2008)، 312۔

11. Muslim bin Hajjaj, *Sahih Muslim*, Vol. 3 (Cairo, Dar al-Hadith, 1412 AH), 1458, Hadith: # 1827.

مسلم بن حجاج، *صحیح مسلم*، ج3(قاہرہ، دار الحدیث، 1412 ھ ق)، 1458، رقم الحدیث1827۔

12. Abdal Hamid bin Hibatullah, Ibn Abi al-Hadid, *Sharh Nahj al-Balaghah Ibn Abi al-Hadid*, Mohaqaq/Mashe: Ibrahim, Muhammad Abul Fazal, Vol.6 (Qum, Mataba Ayut Allah Maraghshi Najfi, 1404 AH), 322.

عبد الحمید بن ہبۃ اللہ، ابن ابی الحدید، *شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید*، محقق/ مصحح: ابراہیم، محمد ابو الفضل، ج6، (قم، مکتبہ آیت اللہ مرعشی نجفی، 1404ق)، 322۔

13. Syed Razi, *Nahj al-Balaghah*, Maktob 79.

سید رضی، *نہج البلاغۃ*، مکتوب79۔

سیرت نگاری: آغاز سے ابان بن عثمان (متوفی: 170ق) تک

Biographical Writings: Since its Beginning to Abban bin Uthman (170 AH.)

Open Access Journal
Qtly. Noor-e-Marfat
eISSN: 2710-3463
pISSN: 2221-1659
www.nooremarfat.com
Note: All Copy Rights are Preserved.

Rasool Jafirian
Professor Rasool Jafarian, Qum, Iran.
E-mail: mohsinkhalid53@gmail.com

Translation: Syed Abu Raza
Lecturar Jamia Al Raza, Bara Khau, Islamabad.
E-mail: raeeskiyan@gmail.com

Abstract:

This paper is a translation of the part of Ustad Rasool Jafarian's book "Political History of Islam- Biography of the Messenger of God (PBUH)" in which the author has presented a comprehensive research on a specific type of Muslim historiography, i.e. "Biography". The author has given an excellent and complete introduction to biography and biographers among Muslims. However, in order to avoid the length, in this paper, the translation of the writings of the above-mentioned book regarding biography and biography is being presented from the beginning of biography writing until Aban Ibn Uthman (died 170).

Ustad Rasool Jafarian claims that biography writings among Muslims were originally consisted of two parts: one, prophecy; Second, The battels (Ghazwat). The first part contained the living conditions of the Holy Prophet's ancestors and it was usually ended on the migration of Holy prophet. The second part of biography writings was consisted of the war and non-war events of Holy prophet at Madinah.